مستنصر حسین تارڑ کے 'سفر در وطن'

ڈاکٹر وحید الرحمٰن

ABSTRACT:

Mustansar Hussain Tarar is an eminent Urdu travel writer. Although many of his travel writings are about foreign countries, unknown lands and unfamiliar regions, yet he has also written extensively about his travels in the mountainous territories, lush green valleys and far off communities of his own country. His inland travelogues portray the civilization, culture and society of Pakistan. They also serve to introduce the beauty and life of those far off mountainous regions of the country, which most of his own countrymen are not even aware of. In this research article, a selection of inland travel writings of Mustansar Hussain Tarar has been analyzed to highlight and discuss the dimension of 'Pakistanism' contained in them.

'سفر در وطن' تصوف کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کے مطابق سالک بشری خصائل اور مذموم انسانی صفات ترک کر کے اطاعت اور فرماں برداری کی محمود ملکوتی صفات حاصل کرتا ہے۔ اس کا سفر چوں کہ خود اپنے باطن میں ہوتا ہے اس لیے وطن میں سفر کی کیفیت کے مشابہ ہے۔ اس میں سالک وجود کے حجابات سے گزرتا ہوا بالآخر خدا تک پہنچتا ہے۔ گویا یہ روحانی سیر الی اللہ ہے۔(۱)

مستنصر حسین تارڑ نے بھی 'سفر در وطن' کا تجربہ کیا ہے مگر اس کی نوعیت روحانی نہیں جسمانی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ ان کے پاس زورِ بیان تو ہے مگر مسائل تصوف سے انھیں کوئی خاص دل چسپی نہیں۔ انھوں نے 'وطن' سے 'وطن عزیز' مراد لیا ہے اور 'سیرِ مقامات' کے لیے انھوں نے وطنِ عزیز کے دور افتادہ اور ناآشنا خطوں، پہاڑوں، وادیوں اور دریاؤں کا انتخاب کیا ہے۔ ذیل میں ان کی کوہ پیمائی اور دشت نوردی کا ایک مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں ان کے منتخب ملکی سفرناموں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ہنزہ داستان

ہنزہ داستان میں احوالِ سفر، داستان کے انداز میں بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس میں قصہ کہانی ہے اور منظر نگاری ہے، مکالمہ آرائی ہے۔ یاد، خوف اور حیرت کی کارفرمائی ہے۔ ایک یاد تو ایسی ہے کہ تارڑ صاحب کے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے ___ اک یاد ہے کہ دامنِ دل چھوڑتی نہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں تارڑ اپنے اساتذہ اور ہم جماعتوں کے ہم راہ...... گئے تھے۔ یہ ان کا اولین تجربۂ سیاحت تھا جسے انھوں نے پہلی محبت کی طرح یاد رکھا ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کرداروں اور واقعات کی ترتیب میں حافظے نے کہیں کہیں بے وفائی کی ہے۔ تارڑ صاحب نے اپنے اس اولین تجربے کو رتی گلی میں بھی بیان کیا ہے ___ مگر برنگِ دگر!

ہنزہ داستان میں مستنصر حسین تارڑ جن شہروں، بستیوں، پہاڑوں اور وادیوں سے گزرے ہیں یا جو مقامات ان کی نظر سے گزرے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: خان پور، ایبٹ آباد، مانسہرہ، اشوکا راکس، چھتر پلین، بٹ گرام، شاہ راہِ ریشم، شیر دریا، تھاکوٹ، بشام، قراقرم، چلاس، جنگل کوٹ، گور، وادی سائی، شاہ گوری، گل گت، ترابزان، بتورا، پھسو اور حسن آباد کے گلیشیئر، کلک، منیتکا، خنجراب اور شمال کے درے، راکاپوشی، دومانے اور ماربل پیک، علی آباد، گنیش، گل مت، بورٹ جھیل، کریم آباد، وادیٔ نگر، علتت، ہنزہ ___ یہ مقامات اپنے ناموں سے زیادہ دل کش، خوب صورت اور حیران کن ہیں۔ تارڑ صاحب نے ان دل کش بستیوں، خوب صورت سرزمینوں اور حیرت انگیز دشتوں کی سیاحی کر کے شہر کے ہنگاموں میں گم لوگوں کو یہ پیغام دیا ہے: خوش رہیں اہلِ وطن، دیوانہ بن میں مست ہے۔ تارڑ کے ملکی سیاحت نامے نہ صرف اہلِ وطن کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں بل کہ اہلِ دنیا کو بھی ان بلند تر مقامات سے متعارف کراتے ہیں۔

وطنِ عزیز کا دور دراز اور دشوار گزار خطہ اس وقت ''عالمی گاؤں'' بن جاتا ہے جب اس کے سٹیج پر مختلف ملکوں کے کردار، سیر و سیاحت کی غرض سے جمع ہو جاتے ہیں۔ ان میں جاپانی ہیں، جرمن اور اطالوی ہیں، فرانسیسی ہیں، وارث گجراتی اور مستنصر لاہوری ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس رنگارنگی کے باوجود اس 'عالمی گاؤں' کے خدوخال مقامی ہی رہتے ہیں۔ مقامی ثقافت اس قدر توانا اور مضبوط ہے کہ یہ ایک عالم سے بے گانہ ہی رہتی ہے، البتہ دنیا بھر کے سیاح فطرت کی اداؤں اور ثقافت کے رنگوں سے آشنا ہونے کے لیے یہاں آتے رہتے ہیں۔ تارڑ صاحب نے ان خطوں میں رہنے والے لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج، بود و باش اور مرگ و حیات کا ذوق وشوق سے مشاہدہ کیا ہے۔ اس مشاہدے کی گفت گو، تحریر میں دل چسپی اور معلومات آفرینی کا باعث بنتی ہے۔ گلگت کے ثقافتی کھیل پولو کے ایک میچ پر تارڑ کا رواں تبصرہ دیکھیے:

> ''پتھر کی چاردیواری پر گلگتی چوغوں اور اونی ٹوپیوں میں ملبوس مقامی موسیقاروں کا ایک گروہ آلتی پالتی مارے بیٹھا پورے جوش وخروش سے اپنی سانسیں اور اپنے ہاتھ چلا رہا ہے جس کے نتیجے میں سازوں میں سے ایک نامانوس اور تیز دھن وجود میں آ رہی ہے جو میدان میں اترے

ہوئے گھوڑوں کو ان کے سواروں کو مہمیز دیتی ہے، انھیں بے چین کرتی ہے اور وہ ایک ایسے خوابیدہ جذبے کے تحت جو ان کے وجود میں جانے کب سے موجود ہے، جسے وہ نہیں جانتے اور یہ موسیقی اسے جگاتی ہے اور وہ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ جانتے نہیں کہ وہ کیا طاقت ہے جو ان کے جسموں میں اتری ہوئی ہے، ان کی آنکھیں فروزاں ہیں او روہ اس کے تابع ہیں، ماتحت ہیں اور اپنی ٹانگیں جانوروں کے جسموں پر بھینچے مقابلے پر آئے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے اس لمحے پتھریلی چاردیواری پر بیٹھے سینکڑوں تماشائی، ایک بلند چبوترے پر کھڑے غیر ملکی سیاحوں کا ایک گروہ ـــــ موسیقار ـــــ اُن پر جھکتی گلگت کی چٹانیں، زرد پڑتی برفیلی چوٹی اور ہوا ـــــ غائب ہیں ـــــ وہ ان سب کو نہیں دیکھ رہے۔ وہ صرف لکڑی کے ایک گیند کو دیکھ رہے ہیں جسے پولوسٹک کی وحشی ضرب سے انھیں گول تک پہنچانا ہے۔''(۲)

ہر شہر کی ایک خاص روح، مزاج اور کیفیت ہوتی ہے جسے صرف اہلِ دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ تارڑ صاحب کی ''شہر شناسی'' قابلِ توجہ ہے۔ وہ جب گل گت کا حالِ دروں بیان کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہزار برس سے شہر کے مکین ہوں:

''گلگت ایک قیدخانہ ہے جس کی دیواریں چٹانیں ہیں، ایک اُداس اور تنہا بستی ہے۔ یہاں ہاورڈ کی قبر تھی جسے انگریزوں کے بقول یاسین ریاست میں سورج کی جانب منھ کر کے قتل کر دیا تھا اور پھر وہ انگریز شاعروں کا محبوب موضوع بنا۔ ڈاکٹر لٹنر اپنے ایک ساتھی کی لاش کو تابوت میں بند کر کے یہاں سے لے گیا۔ لیکن شاید گلگت کی تنہائی اس کی دورافتادگی اور اداسی میں ہی اس کی کشش پنہاں ہے۔

ایک ایسی تہذیب جو کسی حد تک جدیدیت کے رنگ سے بچی ہوئی ہے۔ ایک ایسا گوشہ جس کے چاروں طرف کھڑے پہاڑوں نے پوری دنیا کا شوروغل روک رکھا ہے۔ اس کی ہوائیں ازل سے وہی ہیں جو خالق نے زندگی کا سانس دیتے وقت کائنات کو عطا کی تھیں، ان میں انسانی اور صنعتی آلودگی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا قفس ہے جس کے گوشے میں آرام بہت ہے۔ یہاں صرف دریائے گلگت کی ہلکی آواز ہے یا باغوں میں چلنے والی ہواؤں کی سرسراہٹ ہے۔ اداسی وہ ہے جو انسان روزِ ازل سے اپنے اندر لیے پھرتا ہے اور یہاں آ کر وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔''(۳)

تارڑ صاحب کی 'شہر شناسی' قابلِ تعریف ہے مگر ان کی 'زن شناسی' اور 'زن پسندی' ہمیشہ لائقِ تعزیر ٹھہری ہے۔ وہ اس الزام سے اس وقت فوری بری ہو جاتے ہیں جب ان کے سفرناموں میں وجودِ زن کو مرقعِ رنگین کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا بل کہ کائنات کی ذمہ دار، فعال اور پُراعتماد ہستی کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے۔ ہنزہ کی خواتین کے بارے میں تارڑ صاحب کے احساسات ملاحظہ ہوں:

''ہنزہ کی عورت نے مجھے بے پناہ متاثر کیا____ یہ عورت ہمارے ہاں کی خواتین سے بے حد مختلف ہے۔ جہاں محنت اور مشقت اہلِ ہنزہ کے خون میں شامل ہے وہاں ان کی خواتین میں اعتماد اور اپنی ذات پر بھروسے کی ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو یقیناً قابل تقلید ہے____ وہ سراٹھا کر چلتی ہے۔ گھر میں بازار میں۔ کھیت میں۔ خریداری کرتے، چشمے سے پانی لاتے ہوئے۔ بلند پہاڑوں میں گھرے کسی کھیت میں سے مویشیوں کا چارہ لاتے ہوئے، اس کی کمر کی ہڈی بالکل سیدھی ہوتی ہے، اس کی آنکھوں میں ایسی بے باکی ہوتی ہے جس کے سامنے شاید جنگلی درندے بھی نہ ٹھہر سکتے ہوں____ وہ مردوں سے بات کرتی ہے تو جھک کر، منمناتے ہوئے آنکھیں چُرا کر نہیں بل کہ برابری کی سطح پر جیسا کہ دو انسانوں کو ہونا چاہیے، لیکن ان کا اعتماد اور بے باکی بلند پہاڑوں اور دشوار ترین طرزِ زندگی کا دین ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں جھجکتی ہوئی، نظریں چراتی ہوئی عورت کا گزارہ نہیں ہوسکتا۔ اُسے برفیلے موسموں، پہاڑی راستوں اور گھریلو کام کاج کی زیادتی سے نپٹنے کے لیے ایسا ہونا پڑتا ہے____ وہ مرد کی دنیا میں نہیں، اپنی دنیا میں رہتی ہے____ ہاں یہ ہے کہ یہ پُرکشش آزاد فطرت جب اخلاقیات کی حدود میں آتی ہے تو وہاں وہ وہی مشرقی عورت بن جاتی ہے جس کی اپنی ایک روایت ہے، لیکن ایک فرق کے ساتھ، ہمارے ہاں کی عورتیں کسی بھی ''نازک'' صورتِ حال میں حواس کھو بیٹھتی ہیں کیوں کہ انھیں مرد کے سامنے جانے اور اس سے آزادانہ گفت گو کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا جب کہ ہنزہ کی عورت ایک ٹھوس معاشرتی سسٹم کی وجہ سے اول تو کسی ''نازک'' صورتِ حال کا سامنا کرتی ہی نہیں اور اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس سے پناہ حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے____ میری خواہش ہے کہ پاکستان کی تمام عورتیں اسی قوت اور اعتماد کی حامل ہو جائیں، لیکن شاید ہم مرد یہ برداشت نہ کرسکیں کہ ہماری عورتیں ہم سے برابری کی سطح پر بات کریں___ اس سے ہماری ''مردانگی'' کو ٹھیس پہنچے گی۔'' (۴)

مستنصر حسین تارڑ نے اس سفرنامے میں فطرت کی دیدہ زیب اور باصرہ نواز تصویریں کھینچی ہیں۔ ان میں سے بعض تصویریں تو متحرک اور گویا محسوس ہوتی ہیں اور بعض ایسی ساکن اور پرسکوت ہیں کہ ان پر خامشی فدا ہوتی ہے۔ ایک منظر ملاحظہ ہو:

''وادیٔ ہنزہ کے ڈھلوان کھیت، باغوں کے گوشے، پاپلر کے جُھنڈ اور نیچے گنیش کے قریب دریائے ہنزہ کا بل کھاتا ہوا سرمئی اژدھا جو سارے منظر میں لیٹا ہوا آہستہ آہستہ شُوک رہا تھا اور اُس کی شُوک مدھم ہو کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے سے اُٹھتے ہوئے وادیٔ نگر کے پہاڑ اور ایک تنگ درّہ جس میں ایک سیاہی مائل گلیشیئر جھانکتا ہوا آگے آ رہا تھا۔ گلیشیئر کے عین اوپر دو برف پوش چوٹیاں____ اور نگر تو بالکل آپ کے سامنے ہے لیکن ذرا

بائیں ہاتھ پر راکاپوشی کا شہرِ برف پھیلتا ہے۔ ہم نے اس کے پاؤں تلے سے گزرتے ہوئے اس کی سرد خوب صورتی کا دیدار کیا تھا اور اب یہ ہمارے سامنے کسی بڑے ماڈل کی طرح آراستہ تھا اور ساکت تھا اور حرکت نہیں کر رہا تھا___ صرف ہماری آنکھوں کے لیے۔ میں اور سلجوق اس منظر کے بارے میں سرگوشیاں کرتے رہے جیسے بلند آواز میں بولنے سے یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا۔(۵)

تارڑ صاحب کی **ہنزہ داستان** میں بھی خاصا تحرک ہے۔ پے در پے واقعات پیش آتے ہیں، تیزی سے منظر تبدیل ہوتے ہیں، کردار بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔مختصر یہ کہ خاصی چہل پہل اور رونق ہے___ اور یہی وہ رونق ہے جو بالآخر اس سفر نامے کے قارئین کے منھ پر آ جاتی ہے۔

سفر شمال کے:

سفر شمال کے ایک دشوار سفر کی سادہ اور سہل روداد ہے۔ مصنف نے شمال کی جانب 'مجرد' نہیں 'مخمس' صورت میں یہ سفر کیا تھا۔ یعنی مصنف کی شریکِ حیات اور تین بچے بھی شریکِ سفر تھے:

''موسم بہار کے آخر میں ایک نیلی کار جی ٹی روڈ پر جاتی ہے، اس کے کیریئر پر مختصر سا سامان بندھا ہے تا کہ وہاں سے وہ پیڑھے لاد کر لائے جاسکیں جن کے لیے ہم وہاں جا رہے تھے، کار کا ڈرائیور یہ فقیر ہے، فقیر کے ہمراہ اس کی بیگم ہے جو ہرگز فقیرنی نہیں ہے بل کہ اس کے بڑے ٹھاٹھ ہیں اور پچھلی نشست پر تین بچے براجمان ہیں جو اس فقیر کے اور بیگم صاحبہ کے مشترکہ ہیں اور ہم۔۔۔سوات جا رہے ہیں۔''(۶)

مختصر یہ کہ سوات اور خنجراب کی جانب ایک خاندان سیاحت کی غرض سے روانہ ہے، صاحبِ خانہ جو کار چلا رہا ہے وہ قلم چلانے کے ہنر سے بھی واقف ہے اور ان دوفنون پر مہارت کا نتیجہ یہ سفر نامہ ہے ورنہ ان راستوں سے کئی 'یک فنے' گزرتے ہیں اور خالی ہاتھ واپس لوٹتے ہیں۔ تارڑ کے ہاتھ میں سفر کے انجام پر ایک کتاب ہوتی ہے۔منزلیں خود اس سے رودادِ سفر بیان کرنے کی آرزو کرتی ہیں:شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

تارڑ سفر کے دوران خانگی معاملات میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک آنکھ سے بچوں کی نگرانی کرتے ہیں اور دوسری آنکھ سے پہاڑوں اور وادیوں کا نظارہ کرتے ہیں۔ یہ سفر نامہ اس آنکھ مچولی کے دوران ظہور پذیر ہوا ہے۔ موقع ملنے پر تارڑ کی نظر ''ادھر'' کو بھی لوٹ جاتی ہے اور وہ دزدیدہ نگاہی کا مظاہرہ بھی کر جاتے ہیں۔ ایک مجسمۂ حسن کے ساتھ ہونے والی پیش دستیوں کا ذکر انھی کے الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے:

''اس کے صدر دروازے کے عین سامنے ایک ایسا مجسمہ ہے جو بُت کدہ میں سے نکلا تھا۔کسی دوشیزہ کا دکھائی دیتا ہے، بل کہ مجسمہ کم اور دوشیزہ زیادہ دکھائی دیتی ہے اور یوں بھی جو بھی نوجوان اندر داخل ہوتا ہے وہ ادھر ادھر نگاہ ڈال کر اس کے سر پر اور دیگر حصوں پر ایک عدد تھپکی

ضرور دیتا ہے یوں ''دیگر حصے' باقی مجسمے کی نسبت زیادہ شفاف ہو گئے ہیں۔ میوزیم کے نگران اگر اس دوشیزہ کو نوجوانوں کے ہاتھوں سے بچانا چاہتے ہیں تو کسی شیشے کے شوکیس میں سجا کر رکھیں یا ایسی جگہ ایستادہ کریں جہاں ہاتھ پہنچ نہ سکیں اگر چہ ان دنوں زیادہ تر لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہو چکے ہیں۔''(۷)

تارڑ کا یہ سفرنامہ وطن سے الفت کا ایک پرخلوص اظہار ہے۔ انھیں وطن کے دوردراز خطوں، لوگوں اور زبانوں سے محبت ہے۔ ان کے بقول:

''شہباز خان کام کے آدمی نکلے، وہ سوات پر بہت سا کام کر چکے تھے اور میں سوات کے کام آ گیا تھا یعنی کُشتۂ سوات تھا۔ کہہ لیجیے کہ مجھے ان دنوں سوات ہو گیا تھا، جیسے لوگوں کو عشق ہو جاتا ہے ایسے ہی مجھے بھی کسی مقام کے ساتھ آشنائی کے بعد کچھ ہو جاتا ہے، کبھی ہنزہ ہو جاتا ہے کبھی دریائے گھاگرا ہو جاتا ہے تو جیسے ان دنوں مجھے نانگا پربت ہو چکا ہے اُن دنوں سوات ہو گیا تھا___ شہباز خان نے میرے زخموں پر مرہم رکھا اور سوات کے بارے میں انھوں نے جو تحقیق کی تھی وہ میرے سامنے رکھ دی___ لیکن ہوا یہ کہ سوات کی طرف سے افاقہ ہوا تو مجھے گندھارا ہو گیا___''(۸)

تارڑ صاحب شمال کے حسن و جمال کے عاشق ہیں۔ 'شمال' ان کے لیے جنتِ گم گشتہ کا درجہ رکھتا ہے جس میں داخل ہونے کے لیے وہ ہمیشہ بے تاب رہتے ہیں۔ مثلاشی وہ ترا آبِ رواں ہے کہ جو تھا:

''شمال کی طرف جانے والے راستے کھلنے لگتے ہیں اور پھر میرے ذہن میں اور میرے بدن میں پانیوں کی آواز چلتی ہے اور برفوں کی گونج پھیلتی ہے اور میں سب سے الگ ہو جاتا ہوں ایک جزیرے کی صورت___ اور اس جزیرے کی خواہش یہی ہوتا ہے کہ وہ بہنے لگے اور بہتا بہتا شمال کو جائے___ اگر چہ شمال کو پانی جاتے نہیں وہاں سے اترتے ہیں___ پھر بھی میرے بدن کا جزیرہ ادھر کو بہتا ہے، وہیں کی خواہش رکھتا ہے اور ادھر جانے کی آرزو میں دن رات گزارتا ہے___ شمال نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے___ پاکستانی شمال نے مجھے قابو میں کر لیا ہے اور میں اس کی غلامی سے نکلنا نہیں چاہتا___ جب بھی گرمیوں کا آغاز ہوتا ہے، لوگ موسم کی شدت سے بے زار ہوتے ہیں تو میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں کہ برف پگھل رہی ہے___ راستے کھل رہے ہیں۔ نانگا پربت کے سائے میں فیئری میڈو اور اس کا قدیم جنگل برف میں سے ظاہر ہو رہے ہوں گے۔ سٹرابیری کے پھول جنگل کے فرش پر بچھے ہوں گے، نچلو کے راجہ کے محل میں چیری کے درختوں میں پھل لگ گیا ہوگا___ اور پھر میں ان رسوں کو تڑوانا چاہتا ہوں جن سے مجھے باندھا جاتا ہے اور جن سے میں نے اپنے آپ کو باندھ رکھا ہے___ پاکستان کا شمال میری کم زوری بن چکا ہے۔ یہ درمیانی عمر کی محبت کی طرح مجھے

بے بس کرتا ہے اور بس یہی کہتا ہے کہ میرے پاس آ___ اور میں جانا چاہتا ہوں___''(۹)

تارڑ کو پاکستانی ادیبوں سے شکایت ہے کہ وہ اپنے وطن کے جغرافیے اور ماحولیات سے ناآشنا رہتے ہیں لیکن دیارِ غیر کے بارے میں ان کے پاس معلومات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ پاکستان کے ادیب کا المیہ یہ ہے کہ وہ 'سارے جہاں کا جائزہ' اپنے جہاں سے بےخبر' ہے۔ تارڑ کے بقول:

''سادھو کے آیا تو اس کے اس پاس پھیلے وسیع تالابوں میں سفید کنول کے ہزاروں پیالے تیرتے تھے۔ ان تالابوں کو آپ جوہڑ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ خیال رہے کہ انگلستان میں بھی ذرا وسیع قسم کے جوہڑ ہیں جنہیں ہم لوگ بڑی عقیدت سے جھیلیں کہتے ہیں اور ان کے کنارے کی جانے والی شاعری پر جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ میں بھی ان پاکستانی ادیبوں میں سے ایک ہوں جو اپنے ملک کے موسموں، پھولوں، درختوں اور ان میں رہنے اور اڑنے والی مخلوق سے بےخبر ہیں۔ ہم ایران، انگلستان اور ہندوستان کے زمینی جغرافیے سے تو واقف ہیں لیکن پاکستان کے کس خطے میں گندم کب سنہری ہوتی ہے اور ان دنوں گندم کی بالیوں میں کس قسم کی مہک ہوتی ہے اس بارے میں مکمل طور پر لاعلم ہیں___ بڑا ادب صرف زمین اور اس کے باسیوں کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے اور اگر آپ انھیں نہیں جانتے تو قلم نہ اٹھانا زیادہ بہتر ہے___ انھیں دنوں اپریل کے مہینے میں پنجاب کے دیہات میں اک وسیع گھیرے والا گھنا درخت ''برنا'' پھولوں پر آتا ہے اور اس کی خوشبو کی دھوم سے راہی راستہ بھولتے ہیں۔ دور سے وہ ایک زرد سنہرے بادل کی طرح امڈ کر آتا نظر آتا ہے اور پاس آئیں تو اس کا رنگ ایک الاؤ کی طرح دہکتا ہے___ ہم میں سے کتنے ہیں جو اسے جانتے ہیں اور اپنی تحریر میں اس کا نام لیتے ہیں۔ ہاں چنار اور بیدِ مجنوں کے حوالے ضرور ملیں گے___''(۱۰)

تارڑ نے یہ سفرنامہ سادہ اسلوب میں تحریر کیا ہے۔ ان دنوں وہ پاکستان ٹیلی وژن پر صبح کی نشریات میں میزبان کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے اور ''وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں'' کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ سیاحت کے لیے انھیں صرف دو ہفتوں کی رخصت ملی تھی چناں چہ وہ اس سفر میں قدرے تیزی اور جلدی میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کیفیت ان کے قلم کی روانی پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ مصنف نے نظرفریب مقامات اور چشم دید واقعات کی مصوری نہیں فوٹوگرافی کی ہے۔ کہیں کہیں شعروں کے استعمال سے رنگینی پیدا کی گئی ہے اور فلسفہ آرائی سے بھی رنگ جمانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''میرے سوا بازاروں میں کوئی شخص اوپر نہیں دیکھتا تھا۔ انھیں شاید ان کی موجودگی کی عادت ہو چکی تھی اور یہ ہزاروں بل کہ شاید لاکھوں ابابیلیں اتنے اطمینان سے بجلی کی تاروں پر براجمان تھیں اور بالکل ساتھ ساتھ اور کئی سو گز تک میں انھیں دیکھ سکتا تھا۔ اوپر نیچے آٹھ دس تاریں تھیں جو ان سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی کوئی آواز نہ تھی وہ صرف ذرا سی ہلتی تھیں بولتی نہ تھیں،

شاید گونگی ابابیلیں تھیں اور شاید اس لیے نہ بولتیں تھیں کہ ان کی چونچوں میں کنکر تھے لیکن کس کے لیے؟ ہاں ان لاکھوں ابابیلوں کی چونچوں میں اگر صرف ایک ایک کنکر بھی ہو تو وہ پوری تہذیب کی تباہی کے لیے کافی تھے۔ ایسا ہی ہوتا ہے، ہم اوپر نہیں دیکھتے، ہم اپنے آپ میں مگن ہوتے ہیں اپنے تکبر میں اتنے ڈوبے ہوتے ہیں ہم موت کو یاد نہیں رکھتے اور کبھی اوپر نہیں دیکھتے ہم انصاف اور سچ کے کھیت برباد کرتے چلے جاتے ہیں، انسانوں کو دکھ دیتے ہیں اور تکبر کرتے ہیں اور کبھی اوپر نہیں دیکھتے کیوں کہ اگر ہم اوپر دیکھیں گے تو وہاں لاکھوں ابابیلیں منتظر ہیں، وہ بولتی نہیں کہ ان کی چونچوں میں کنکر ہیں، شاید قدرت بھی ہم سے تنگ آ چکی ہے اور وہ پھر ایک بڑی تبدیلی چاہتی ہے جس پر ہمارا کوئی اختیار نہ ہوگا اور ہم اوپر نہیں دیکھتے جہاں لاکھوں ابابیلیں پہلو بدل رہی ہیں۔''(۱۱)

''اس کمرے میں دیار کی خوشبو تھی اور ایک ٹھنڈک تھی اور ایک تنہائی تھی جواب اتنے برسوں بعد بڑی ہوگئی ہے، تنہائی ایک وبا کی طرح پھیلتی ہے ___ یہ بڑی ہو جاتی ہے اور پھر ختم نہیں ہوتی یہاں تک کہ انسان ختم ہو جاتا ہے اور پھر اسے آخری تنہائی مل جاتی ہے ___''(۱۲)

ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ضمیر کے شعر اور داغ کے مصرعے سے عبارت دل کش ہوگئی ہے:

''سوات کے بارے میں آپ جس سے بھی کلام کریں وہ کہے گا کہ کالام ___ اور یہ تو محاورہ ہے کہ اصل سوات تو کالام کے بعد شروع ہوتا ہے ___ منگورہ مدین اور بحرین تو شہر ہیں لیکن کالام کالام ہے ___ اور حتمی اور آخری بات تو ضمیر جعفری نے کہہ دی ہے کہ:

جام تک آئے مئے گلفام تک آئے نہیں
جو سوات آئے مگر کالام تک آئے نہیں

چناں چہ خواہش تو یہی تھی کہ اگر جام تک آ ہی گئے ہیں تو مئے گلفام تک بھی پہنچ جائیں لیکن اس خواہش کے راستے دو چار سخت مقام آتے تھے۔''(۱۳)

تارڑ نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ ''خوش حال خاں خٹک نے کہا تھا کہ وادیٔ سوات بادشاہوں کے دلوں کو خوشی سے بھر دیتی ہے۔''(۱۴) وادیٔ سوات کی یہ روداد بھی کچھ دیر کے لیے پڑھنے والوں کے دلوں کو خوشی سے بھر دیتی ہے۔

چترال داستان:

چترال داستان کیا ہے؟ قصۂ پارینہ، چھوڑی ہوئی منزل یا فتراک کا نخچیر!!! اس سوال کا جواب خود تارڑ صاحب نے خاصے بلیغ پیرائے میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جن سفروں کی مسافت میں ابھی بہت دن نہ گزرے ہوں......ابھی آپ کے ٹریکنگ بوٹس

کے تلوں میں چند ایک کنکر......کنکورڈیا کے...... کسی پامیری ندی کی تہہ کے، کسی بیافو گلیشیر کے یا کسی وادیٔ سوختر آباد کے...... پھنسے ہوئے ہوں...... خیمے کے کپڑے میں کسی برالڈو یا ورگوتھ ندی کی نمی موجود ہو......اس کولے میں خریدے گئے یاک کے چمڑے کے پھندنوں والے بوٹ موجود ہوں اور اُن مین سے ایک عجیب، دوسروں کے لیے ناگوار لیکن میرے لیے خوش کن بُو اٹھتی ہو......تو ایسے سفروں کے قصے آسانی سے بیان کیے جا سکتے ہیں۔اُن کی تصویروں کے رنگ ابھی پھیکے نہیں ہوتے......سفری ڈائری کے ورق ابھی بکھرے نہیں ہوتے...... یہ تصویریں، یہ ڈائری، سب کچھ بیان کرتی جاتی ہیں اور آپ لکھتے جاتے ہیں......ابھی آپ اسی وارفتگی، اُسی وجد اور آوارگی کی بے خودی میں ہوتے ہیں......اور اک گونہ بے خودی ابھی دن رات میں ہوتی ہے اور آپ اُسی حالتِ وجد میں لکھتے جاتے ہیں......لیکن جو سفر بھولتے جاتے ہوں،انھیں بیان کرنا دشوار ہو جاتا ہے......جیسے ہر عظیم کھنڈر کی، ہر ہڑپہ، مہر گڑھ اور موہنجوڈارو کی مختلف تہیں ہوتی ہیں...... بالائی تہہ کو سمجھنا اور اسے بیان کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے لیکن اُس کے نیچے پوشیدہ چھٹی یا ساتویں تہہ تک پہنچنا اور اس کا قصہ سنانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا...... آپ کہیں بھی ٹھوکر کھا سکتے ہیں......میں مختلف سفروں کا رہینِ ستم رہا اور اُن کی کہانیاں کہتا رہا......اور پھر میں ذرا سست ہو گیا۔ میں ذرا ''شمشالِ بے مثال'' کا تذکرہ کر لوں......''یاک سرائے'' میں قیام کی داستان سنا لوں...... ''سنولیک'' تک پھر سے چلا جاؤں......اور یوں دیر ہوگئی...... میں ہمیشہ دیر نہیں کرتا......لیکن اس مرتبہ دیر ہوگئی لیکن اس کے باوجود میں اس سفر کے خیال سے غافل نہیں رہا......چوں کہ یہ ایک ایسا سفر تھا جسے میں بھولتا جاتا ہوں...... مجھے اس کے راستوں کی تفصیل اور ذرّے ذرّے میں جو کچھ دکھائی دیتا تھا، یاد نہیں......میں گردِ سفر کو کتنا ہی صاف کیوں نہ کروں اُس کی تصویر دھندلی ہے......چناں چہ یہ ایک دھندلاتا ہوا...... گم ہوتا......گرد آلود سفر نامہ ہے......اس میں تفصیل نہیں ہوگی......یادوں کے موذیک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوں گے جو جڑ کر شاید اس کی تصویر مکمل کر دیں......یا نہ کریں......''(۱۵)

تارڑ صاحب نے 'عذرِ گناہ' کے ساتھ ساتھ سفر نگاری کا ایک زریں اصول بھی متعین کر دیا ہے کہ سفری یادداشتوں کو قلم بند کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔قصہٴ زمیں کو برسرِ زمیں ہی نمٹا دینا چاہیے۔ بہ صورتِ دیگر سفر کے دوران حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات کی تازگی اور تابانی ماند پڑ جاتی ہے۔ چناں چہ چترال داستان کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

اس سفرنامے میں گلگت، وادی گوپس، خلطی جھیل، وادی پھنڈر، ہرچن، مستوج، ترچ میر، کوغزی، درہ شیندور، وادی بمبوریت، چترال اور کافرستان ــــــ جیسے دور افتادہ اور دشوار گزار مگر خوش نما اور دل کشا مقامات کی

تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس داستان میں وطنِ عزیز کی ان وادیوں، دریاؤں، دروں، پہاڑوں اور جھیلوں کا احوال سنایا گیا ہے جن کے حسن و جمال سے زیادہ تر ہم وطن بے خبر ہیں۔ تارڑ صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ ''رب کے بنائے ہوئے منظروں کی توصیف اگر انسان نہ کرے تو ان کا چرچا نہیں ہوتا۔'' تارڑ صاحب نے وطن کے دل فریب نظاروں اور فرحت بخش بہاروں کو متعارف اور معروف کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کی ادبی اہمیت بھی ہے اور قومی بھی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں حسنِ فطرت کے سامنے نبضِ کائنات کے ڈوبنے کی منظر کشی کی گئی ہے:

> ''یہ پاکستانی شمال کی ایک دل کشی ہے کہ وہاں، کہیں الگ تھلگ، ایسے مقام، ایسے گھر ہیں جہاں وقت، زمان و مکاں ایک سکوت میں آ چکے ہیں......اس سکوت میں وقت رُکا ہوا ہے......کہاں؟ وہاں، جہاں وقت کے گھڑیال کی سوئیوں نے پہلی حرکت کی تھی......سو برس پیش تر یا ہزار برس پہلے...... یہ تو وقت ہی بتا سکتا ہے......لیکن وہ تو گنگ ہے، بتا نہیں سکتا، رُکا ہوا ہے...... اور جب آپ اُس سکوت کے اندر داخل ہوتے ہیں ایک مختصر کواڑ میں سے جھک کر، سمٹ کر......تو ایک سرد خاموشی میں، طاؤس کے گاؤں میں......ایک ایسی رہائش گاہ ہے جس میں پھل دار درختوں اور تالاب کے کناروں سے کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے...... پرندے بولتے ہیں...... تالاب میں تیرتی بطخیں اُن اجنبی مہمانوں پر ایک نظر ڈالتی ہیں جو بہت دور سے آئے ہیں اور اُن کے مہاندرے مختلف ہیں......ایک طویل چوبی برآمدے میں نیچی چھتوں والے کمروں کی کھڑکیاں کھلتی ہیں جن میں سے بچوں اور عورتوں کے چہرے جھانکتے ہیں جن کے لبادے ناآشنا اور شکلیں دل کش ہیں......اور ایک خاموش ٹھنڈک اُتری ہوئی ہے جو درختوں تلے گہری ہوتی ہے...... یہاں نظر دور تک نہیں جاتی......سیب، ناشپاتی، بادام، اخروٹ، خوبانی اور آلوچے کے گھنے درخت اِسے روک لیتے ہیں......ان درختوں تلے پھلوں کے فرش بچھے ہیں اور اُن کے رنگ سبز گھاس کی ٹھنڈک پر نکھرتے اور شوخ ہوتے ہیں...... یہ زمان و مکاں کا الگ تھلگ سکوت......!''(۱۶)

اس سفر میں بھی تارڑ صاحب کے افرادِ خانہ ان کے ہم راہ تھے۔ تارڑ صاحب کے فرزند، دختر اور اہلیہ (سمیر، سلجوق، عینی، میمونہ بیگم) اب قارئین کے لیے نامانوس کردار نہیں رہے بل کہ وہ اس تواتر سے شریکِ سفر رہنے لگے ہیں کہ سفر نامہ کبھی کبھی ''ہم سفر نامہ'' بن جاتا ہے۔ اس شرکت کا ایک فائدہ قاری کو یہ پہنچتا ہے کہ اسے تارڑ صاحب جیسے اہم ادیب کے بارے میں بعض نجی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اور وہ 'رازِ درونِ خانہ' سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ قاری کی حیثیت محض 'چراغِ راہ گذر' کی سی نہیں رہتی۔

مستنصر حسین تارڑ کے مزاج میں افسانہ طرازی شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے عام سے کرداروں اور معمولی واقعات میں حیرت کا کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ کسی بھی عام انسان کے کردار کی 'لغزشِ خفی' ان کی توجہ اور دل چسپی کا سبب بن جاتی ہے اور وہ اسے 'خلوتِ خاص' میں طلب کر لیتے ہیں۔ ان کی افسانہ طرازی، ادنیٰ کو

اعلیٰ کر دیتی ہے۔ انھیں اعلیٰ کو ادنیٰ کرنے کا ہنر بھی آتا ہے لیکن یہ ہنر وہ اس وقت آزماتے ہیں جب انھیں کسی شخصیت سے اصولی یا نظری اختلاف ہوتا ہے۔ عام طور پر وہ گم نام اور بے چہرہ لوگوں کی صورت گری کرتے رہتے ہیں۔ چترال کے سفر میں ان کے سہولت کار ایک جنرل صاحب تھے مگر تارڑ صاحب نے ان دو جیپوں اور ڈرائیوروں کو زیادہ شوق اور حیرت سے دیکھا ہے جو انھیں جنرل صاحب نے فراہم کیے تھے۔ ان ڈرائیوروں کا ابتدائی تعارف کچھ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

''ڈرائیور نمبر ایک......باریش مولوی غازی کو خصوصی طور پر ہمارے لیے تعینات کیا گیا تھا کیوں کہ وہ اس دریائے غذر کے کنارے، جس کے کنارے ہماری جیپیں ایک روڈ کی تہمت پر اپنے ٹائر ایک جانب چٹانوں سے ٹکرانے اور دوسری جانب کھائی کے کناروں سے گرنے سے بمشکل بچاتی تھیں......پِنگل نامی گاؤں کا باسی تھا جو اِسی روڈ پر کہیں آگے تھا اور یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ غازی مہاآتما ہے جو سب جانتا ہے اور جس کی روح اکثر اس کے بدن کو چھوڑ کر وادیٔ گوپس اور وادیٔ پھنڈر کے درمیانی علاقوں میں سرِ شام جوگنگ کرتی ہے، ان وادیوں کا طائرانہ مطالعہ کرتی ہے اور پھر دانش سے سرشار ہو کر واپس آ جاتی ہے، اور اُس نے گلگت میں اپنی جیپ سٹارٹ کرنے سے پہلے اعلان بھی کر دیا تھا کہ صاحب، ہم اس علاقے کا ذرّہ ذرّہ جانتا ہے اور ذرّہ ذرّہ ہمیں جانتا ہے تو آپ کو ایسے لے کر جائے گا جیسے یاک ہم لوگوں کو لے کر درّہ درکوت کے پار جاتا ہے......اور ڈرائیور نمبر دو......اسلم نام کا ایک ٹپیکل مہاندرے والا فوجی جس کی کوئی شناخت نہیں ہوتی...... نہ اُس کی شکل میں کوئی خاص بات ہوتی ہے اور نہ اس کی باتوں میں کوئی رمز ہوتی ہے......وہ بالکل براہ راست سیدھا سیدھا ایک فوجی تھا اور ایک ڈرائیور تھا......ایسی بے شناخت شکل والا جو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جنگ کا ایندھن بنتے ہیں اور بھسم ہو جاتے ہیں اور اپنی شخصیت کا کوئی الگ نشان چھوڑ کر نہیں جاتے صرف ان کا فوجی شناختی کارڈ اور رینک فائلوں میں درج ہو کر تہہ خانوں میں گم ہو جاتا ہے......اور یہ اسلم، ہکلا کر، گھبرا کر بات کرتا تھا......''(۱۷)

تارڑ صاحب کے پاس ایک شاعر کا دل اور ایک افسانہ نگار کا دماغ ہے۔ فطرت کے مناظر کا نظارہ کرنے سے ان کا دل دھڑکنے لگتا ہے اور زندگی کی ادائیں دیکھ کر ان دماغ میں افسانے جنم لینے لگتے ہیں۔ ایک مسافر کو سفر کے دوران مختلف تجربات اور واقعات سے گزرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات، واقعات اتنے غیر معمولی اور حیران کن ہوتے ہیں کہ کسی افسانہ طرازی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن تارڑ صاحب معمولی واقعے کو مبالغہ آرائی سے پیش کرتے ہوئے افسانہ بنا دیتے ہیں۔ یہ وہ خوبی ہے جو ان کے سفرناموں کی دل چسپی اور مطالعگی میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک واقعہ ملاحظہ جو جس میں افسانے کی دل فریبی پائی جاتی ہے:

''یہ بوڑھی عورت، تہذیب کے عناصر سے بالکل ناآشنا......شاہراہِ ریشم سے نیچے، جہاں اُس

کے آباؤاجداد ہزاروں برسوں سے رہتے آئے تھے......دریا کے اوپر جو ویران پہاڑ ہیں وہاں اپنی بکریاں چرانے لے جایا کرتی تھی......اور شام ڈھلے لوٹ آتی تھی...... وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ غربت اور افلاس کی بدترین سطح پر زندہ ہے......کیوں کہ اُس کے لیے ہمیشہ سے یہی زندگی تھی......ایک روز اس نے ان بلند و ویران پہاڑوں میں......اپنے قدموں کے آگے......کوئی شے دیکھی......جو چمکتی تھی......پیتل کی کوئی شے...... وہ اُسے اٹھا کر اور بمشکل اٹھا کر کہ وہ بہت وزنی تھی اپنے جھونپڑے میں لے آئی...... بہت دنوں تک یہ پیتل اُس کے جھونپڑے میں پڑا رہا...... پھر ایک روز...... وہ اُسے فروخت کرنے کی آرزو میں......کہ شاید مجھے اس کے عوض......ایک دیگچی مل جائے......آٹے کا ایک تھیلا مل جائے......پتن کے ایک سنار کے پاس لے آئی......اس نے پیتل کو کھرچا اور کہنے لگا ''مائی......یہ تو سونا ہے......خالص سونا...... اور اس کا وزن سترہ کلو کے قریب ہے......میرے پاس تو ایک تولے سے زیادہ کے لیے رقم نہیں ہے......تم اسے سوات لے جاؤ......منگورہ لے جاؤ......اس کے بعد کا قصہ بہت طویل ہے......اور قصہ مختصر......یہ گلوبند ایک پولیس افسر کی فرض شناسی اور اپنی تاریخ کو بچانے کے جذبے کی وجہ سے اِدھر اُدھر نہ ہوا اور بحق سرکار ضبط ہو گیا......اب یہ صوبہ سرحد کے سرکاری خزانے میں جمع ہے......اور پھر کل دنیا میں یہ خبر نشر ہوئی کہ پاکستان کے کسی گم نام قصبے پتن میں ایک تاریخ کے آغاز سے قبل کا......خالص سونے کا سترہ کلو وزنی ہار دریافت ہوا ہے جس پر عجیب و غریب نقش اور صورتیں کندہ ہیں......(۱۸)

مستنصر نے تحریر کو پُرلطف بنانے کے لیے کچھ سنے سنائے قصے کہانیوں کو بھی سفرنامے میں شامل کیا ہے۔ ان میں 'ترچ میر کے تابوت کا قصہ' خاصا اثر انگیز اور اداس کن ہے۔ اس کے علاوہ تارڑ صاحب نے ان زمانوں کو بھی یاد کیا ہے جب وہ اپنے ایک ٹی وی ڈرامے ''کالاش'' کی تیاری کے سلسلے میں فن کاروں کے ہم راہ یہاں آئے تھے۔ فلیش بیک کی تکنیک کے استعمال کی یہ ایک سادہ سی کوشش ہے۔

چترال داستان گو ایک بھولی بسری داستان ہے مگر مصنف نے اسے خوب یاد کیا ہے۔ تو مصیبت میں عجب یاد آیا!

رتی گلی:

ایک ''ایسپ کہانی'' میں کچھوے کے خول کی تعبیر یہ پیش کی گئی ہے کہ کچھوا دعوت کے باوجود دیوتا کی شادی میں شریک نہ ہوا اور گھر ہی میں قیام پذیر رہا، چناں چہ سزا کے طور پر اس کی پشت پر اس کا گھر ہمیشہ کے لیے مسلط کر دیا گیا___ رتی گلی میں تارڑ صاحب کی پشت خالی دکھائی دیتی ہے اور ان کے شانوں پر افرادِ خانہ سوار نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سفرنامے میں شمعِ تخلیق کی لو زیادہ اونچی اور روشن ہے۔ ان کو یہاں وہ فراخی،

آزادی اور بے فکری میسر تھی جو ایک ایسے سیاح کو خاص طور پر درکار ہوتی ہے جو مصنف بھی ہو۔ رتی گلی میں تارڑ صاحب کا تخیل فعال اور تاباں ہے، جو ہر تخلیق زیادہ نمایاں ہے، تجربۂ سفر نادر ہے اور ذوقِ نظر خوب تر ہے۔

تارڑ صاحب نے سفرنامے میں 'ماضی پرستی' کا تجربہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے ماضی کی بازآفرینی کرتے ہوئے سفرنامے میں فلشن کی تکنیک استعمال کی ہے۔ رتی گلی کی جانب سفر کرنے سے قبل وہ ماضی کی ایک گلی کی جانب مڑ جاتے ہیں۔ انھیں قریباً نصف صدی قبل کا قصہ یاد آتا ہے جب وہ کالج کے دوستوں کے ہم راہ، ایک سخت گیر استاد کی نگرانی میں انھی پہاڑوں، وادیوں اور جھیلوں کی جانب عازمِ سفر ہوئے تھے۔ حافظے کی خوبی، تخیل کی کرشمہ سازی اور تخلیقی ہنرمندی نے اس سفر کے 'نقوشِ پا' کو تازہ کر دیا ہے۔ ماضی کی ایک تصویر ملاحظہ ہو جب 'تازہ واردان' ناران میں دریائے کنہار کے کنارے برطانوی راج کے ایک ڈاک بنگلے میں 'عشائیے' سے لطف اندوز ہو رہے تھے:

> ''موم بتیوں کی رومانوی جھلملاہٹ میں...... ہمارے نوخیز امیدوں بھرے ہیجان خیز چہرے دمکتے تھے۔ باہر جو سرد رات تھی اُس میں تاریک جنگلوں سے اترتی ہوئی سرسراہٹیں دریائے کنہار کے شور سے ہم آغوش ہو کر ڈائننگ رُوم کی کھڑکیوں سے سر پٹختی پسپا ہوتی تھیں۔ باقاعدہ کرسیوں پر بیٹھ کر کہ اُن دنوں کم از کم میں تو اُس چنگیز کے گرد جس میں امی جان کے توے سے گرم گرم روٹیاں اُترتی تھیں، پیڑھی پر براجمان ہو کر ہی ڈنر کرتا تھا......میز پوش سے ڈھکی پرانی میز کے گرد بیٹھ کر......کیسا ناقابلِ فراموش ڈنر کیا۔ جہاں ہم نے شاید زندگی میں پہلی بار سُوپ نام کی کوئی شے سُر کی اور پی......اور پھر بوائز کے سامنے سجی مِڈ ونٹر سٹریفورڈ شائر کے ڈنر سیٹ کی پلیٹوں میں تازہ......تلی ہوئی ٹراؤٹ مچھلی، آلو کے قتلوں اور اُبلی ہوئی سبزیوں کے ساتھ اُتری......اور اس شبِ یکتا میں...... جس میں ہم نے زندگی کا پہلا سُوپ پیا اور پہلی ٹراؤٹ کھائی اور موم بتیوں کی مدھم روشنی میں کھائی سب سے یادگار وہ خانساماں یا ویٹر تھا جو ہمیں سرو کر رہا تھا......ایک طرّے دار پگڑی، اچکن اور چوڑی بیلٹ میں ملبوس یہ خانساماں......شاید ابھی تک لاعلم تھا کہ انگریز سرکار کو رخصت ہوئے نو برس ہو چکے ہیں اور وہ صرف انگریزی بولتا تھا اور ہم سب کو ''صاحب'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا...... سرو کرتے ہوئے جھکتا تھا اور پھر ''تھینک یو سر'' کہہ کر سیدھا ہوتا تھا......(۱۹)

یاد رہے کہ اس سفرنامے میں سامانِ شکم کی کم یابی کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی کیا گیا ہے۔ البتہ وہ بیان خاصا دل چسپ ہے جو مریدوں کی سادہ لوحی اور اہلِ شکم کی فتح یابی کے باب میں ہے:

> ''اور صرف یہی نہیں......نہایت احترام سے......ایسے کہ ہمیں خبر نہ ہوا گرچہ ہم کن اکھیوں سے سب خبر رکھتے تھے، انھوں نے وادیٔ کاغان کا سب سے فربہ اور پلا ہوا دُنبہ ہمارے اعزاز میں ذبح کیا اور اب وہ ایک الاؤ پر بھونا جا رہا تھا......ذرا تصور تو کیجیے کہیں بلند پہاڑوں میں گھرے

دُور دراز کے ایک سبز گھاس اور مختصر چٹانوں والے میدان میں رتی گلی کی برفوں کے دامن میں...... ہم مزے سے گھاس پر استراحت فرماتے تھے جب کہ ہمارے بدن تھائی لینڈ کی حسینائیں نہ سہی نیم وحشی گوجر حضرات دباتے تھے اور عقیدت سے دوہرے ہوئے جاتے تھے اور شام کے بعد رات ہو چکی تھی اور ہم اپنے اوپر پھیلے نزدیک ہو چکے آسمان کو تکتے تھے جس میں سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اس گھاس بھرے میدان میں گرتے تھے اور ہمارے نتھنوں میں الاؤ پر روسٹ کیے جانے والے دُنبے کی سلگتی چربی کی خوشبو دُھو میں مچاتی تھی اور ہوائیں سرد تھیں...... یہ کچھ تو ایک جنت ارضی میں ہی ممکن تھا اور ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔''(۲۰)

رتی گلی کے پس ورق پر تارڑ صاحب کی 'سیاہ و سفید' تصویر، ان کی جوانی اور سفر کی حیرانی کو ظاہر کرتی ہے۔ انھوں نے اس تصویر کی تصویر کشی نہایت مؤثر الفاظ میں کی ہے:

''کہیں میری کسی بوسیدہ البم میں...... جسے باندھنے والے دھاگے بھی بھر بھرے ہو کر اس کے اوراق کو بکھر جانے کی اجازت دینے کو ہیں...... سینتالیس برس پیش تر کے زمانوں کی ایک تصویر ہے...... بلیک اینڈ وہائٹ...... جس کا وہائٹ بھی بھورا ہونے لگا ہے...... میرے پہلے کیمرے، ایک کوڈک بے بی براؤنی کیمرے سے کھینچی ہوئی...... جس میں ایک سترہ برس کا، کچی اور کومل عمر کا چھریرے بدن کا...... مجھے شاید دس بارہ دنوں کے بعد شیو بنانے کی حاجت ہوتی تھی...... ایک لڑکا کھڑا ہے جھیل سیف الملوک کے کنارے...... پس منظر میں دور تک پانیوں پر کروٹیں ساکت ہیں...... فوجی بوٹوں میں، آرمی سویٹر میں ڈھیلی براؤن پتلون میں ،ایک گورکھا ہیٹ لاپروائی سے کاندھوں پر لٹکائے، چوڑے ماتھے پر مروجہ فیشن کی پیروی میں گھنگھریالے بالوں کی لٹ ڈالے...... کہیں دور افق کے پار تکتا ہوا...... کہ یہ بھی مروجہ فیشن تھا کہ تصویر اترواتے ہوئے کھو سے جاؤ اور اداسی سے افق کے پار تکتے جاؤ...... اور اس لمحے اُس لڑکے کو کیا علم کہ مستقبل میں کیا پوشیدہ ہے...... کہ وہ بقیہ لڑکوں کی مانند کبھی بھی ایک کامیاب زندگی نہیں گزارے گا...... کسی بڑے عہدے پر نہیں پہنچے گا۔ ایک بے مقصد آوارگی اور کوہ نوردی اُس کا مقدر ہو گی...... اُفق کے پار جو کچھ کاتبِ تقدیر نے لکھا تھا وہ اسے پڑھ نہ سکتا تھا...... اگر پڑھ سکتا تو وہیں تو بہ تائب ہو کر ذی ہوش اور نارمل ہو جاتا...... پر نہ ہوا۔''(۲۱)

تارڑ صاحب کی تحریروں میں ظرافت بھی اپنی بہار دکھاتی ہے جو ان کے مزاج کی فطری شوخی اور بے تکلفی کی آئینہ دار ہے۔ اس کی طبیعت میں ''تفنن'' بھی ذرا سا۔ یہ ''ذرا سا تفنن'' کبھی کبھار تو نقطۂ کمال تک جا پہنچتا ہے اور تارڑ صاحب ایک پختہ کار مزاح نگار کی طرح شخصیات اور واقعات میں نہاں مضحک اداؤں کو نمایاں کرنے لگتے ہیں۔ وہ 'لفظی بازی گری' سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ اس سفرنامے میں خوباں سے چھیڑ چھاڑ نہیں ہے تاہم لفظوں اور ہم سفروں سے وہ دل لگی کرتے رہتے ہیں۔ اپنے ہم

سفروں کی صورتوں اور عادتوں پر وہ کڑی نظر رکھتے ہیں اور انھیں بیان کرتے ہوئے وہ کچھ زیادہ 'مسافر نوازی' کا مظاہرہ نہیں کرتے:

''ان میں سے چارتو گانٹھ کے پکے آزمودہ، تجربہ کار اور کمینے قسم کے پروفیشنل درویش تھے یعنی میاں فرزند، بل کہ فرزند، سلمان، جو اب باقاعدہ شادی شدہ ہو چکا تھا لیکن اُس کے بھالوپن میں کمی کی بجائے اضافہ ہو چکا تھا......خان سلیم، ہمہ وقت دانت نکالتا اپنے اوپر فقرے کستا، بے مثال حسِ مزاح کا مالک اور گمان نہ ہونے دیا تھا کہ وہ ایک ملٹائی نیشنل کا ایگزیکٹو ہے......لگتا یہی تھا کہ موصوف نے پوری عمر بازارِ حسن کے کسی تھڑے پر بیٹھ کر جگتیں کرنے میں گزاری ہے......اور یہ خاک سار تمام تر برائیوں کی جڑ، بوڑھا کائیاں اور کمینگی میں سب سے بدتر جوان سب کو یہاں لے آیا تھا......

ان چاروں کے سوا دو نئے رنگروٹ تھے......قیصر تھا......سگریٹ پھونکتا......اگر کسی زرافے پر فریفتہ ہوتو آسانی سے اُس کا بوسہ لے سکے، اتنا دراز قد......سلمان کی جاپانی فرم میں اُس کا کولیگ تھا اور اس کی ضمانت پر ہم نے اُسے قبول کیا تھا......پہلی بار کوہ نوردی کے لیے کمربستہ ہوا تھا......اگرچہ یہ بستہ کھل گیا......اور بٹ صاحب......خان سلیم نے اسلام آباد سے فون کیا کہ سر جی اگر آپ اجازت دیں تو میرا ایک دوست بہت منت سماجت کر رہا ہے کہ خان جی مجھے بھی ساتھ لے چلو......میں نے پوچھا......شہزادے......وہ بندہ کیسا ہے؟ تو خان سلیم نے نہایت بردباری سے مطلع کیا کہ سر جی وہ بندہ تو نہیں بٹ ہے......لے آؤں؟''(۲۲)

تارڑ صاحب کے ہاں جہاں طنازی اور مزاح نگاری کے جوہر دکھائی دیتے ہیں وہاں افسانہ طرازی بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ وہ واقعے کو افسانہ اور افسانے کو داستان بنانے کے فن سے واقف ہیں لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ زمانہ شوق سے ان کی داستان سن رہا ہوتا ہے مگر وہ داستان کہتے کہتے سو جاتے ہیں۔

تارڑ صاحب نے وادیٔ کاغان میں جا بجا بکھری ہوئی فطرت کی رعنائیوں اور رنگینیوں کو سمیٹنے کی سعی کی ہے۔ فطرت کے مقابل ان کے دامن کی تنگی کی جانب انگشت نمائی کی جا سکتی ہے مگر ان پر ''چشمِ تنگ'' کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ 'کثرتِ نظارہ' نے انھیں 'وسعتِ نظارہ' کی دولت سے نواز رکھا ہے۔ نظارگی نے محض ان کی نظر کو کشادگی عطا نہیں کی بل کہ ان کے زورِ قلم میں بھی اضافہ کیا ہے۔ جھیل دودی پت کے دامن میں پھولوں کی ایک وادی دیکھ کر ان کی نثر بھی گل رنگ ہوگئی:

''غالب کی بہار کے دنوں میں چمن پھولوں سے یوں اٹ جاتا تھا کہ مرغانِ چمن اُڑان کا قصد کرتے تھے تو اُن کے پاؤں اُن کے انبار میں اُلجھ اُلجھ جاتے تھے......تصور کی آنکھ سے غالب نے پھولوں کے جو انبار دیکھے وہ ان انباروں کے مقابلے میں جو ہماری کھلی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، ہیچ تھے......حقیر اور بے وقعت تھے......یہ تو میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں......میں نے

جب سے دو تین برس کی عمر میں کسی پھول کو دیکھ کر ''پُھو ......پُھو'' کہا تھا، اب تک اس حیات میں جتنے بھی پھول دیکھے تھے وہ میری نظر میں خوش رنگ اناروں کی مانند پھوٹتے ہیں تو اگر ان کا حساب کتاب کیا جائے...... کسی چاٹرڈ اکاؤنٹینٹ کو اس کام پر مامور کیا جائے کہ براہ کرم......رتی گلی کی چوٹی سے اترتے ہوئے گل لالہ کے جو تختے بچھے تھے......کوہ الپس کے دامن میں جو الپائن پھولوں کے جمگھٹے تھے...... وادئ رُوپل میں نانگا پربت کے سرد پانیوں سے سیراب ہوتے جو سٹے دار گلابی معجزوں کے ڈھیر تھے جنھیں سمیر اپنی لامبی ٹانگوں کے ساتھ ٹاپتا تھا......اردوکس کی بلندیوں پر جو دوچار پھول تھے انھیں بھی شامل کر لیجئے......سنولیک کے سفر کے دوران زرد پھولوں کے جو بادل آسمان کو چھوتے تھے...... وادئ سوات کے قبرستانوں میں جو گل لالہ اور نرگس نمایاں ہوتے تھے......وادئ کرومبر کی ایک آبشار کے گرد جواَن چھوئے ہجومِ گل تھے......چلیے ان خودروخوب صورتیوں میں وہ تمام پھول بھی شامل کر لیجیے جو میں نے آج تک فلاورشوز میں دیکھے...... اپنے گھر میں اُگائے......فلاور شاپس سے خرید کر پیش کیے......جو مجھے پیش کیے گئے......ان میں سہرے کے پھول بے شک نہ شامل کیجیے لیکن کچھ زرد گلاب اور نرگس کے ایسے پھول بھی تو دھیان میں رکھیے جن میں بدن کی گرمی حدت دیتی تھی......تو چلیے صرف ان سب کی گنتی کر لیں......تو براہ کرم چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ صاحب حساب تو لگائیے کہ کل کتنے تھے......وہ جتنے بھی تھے وہ سب کے سب بہت کم تھے......ہیچ اور حقیر تھے ان پھولوں کے مقابلے میں جن میں ہم چلتے تھے اور مرغانِ چمن کی مانند ہمارے پاؤں بھی ان میں الجھتے تھے......اور جو آس پاس کی ڈھلوانوں کو ڈھکتے برفوں تک جاتے تھے اور اُن برفوں پر بھی گل رنگ عکس دکھائی دیتے تھے......اتنے پھول تھے......''(۲۳)

رتی گلی میں سفری داستان کو قدرے کم رفتاری سے پیش کیا گیا ہے۔ کچھوے کی رفتار سے یہ داستان آگے بڑھتی ہے مگر کام یابی سے منزل سے ہم کنار ہوتی ہے۔

حوالہ جات:

(۱) قاضی جمال حسین، **خواجہ میر درد**، دہلی: ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص۹۴

(۲) مستنصر حسین تارڑ، **ہنزہ داستان**، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۱۰۰، ۱۰۱

(۳) ایضاً، ص۸۵

(۴) ایضاً، ص۱۸۹، ۱۹۰

(۵) ایضاً، ص۱۸۲

(۶) مستنصر حسین تارڑ، **سفر شمال کے**، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء، ص۱۵

(۷) ایضاً،ص۵۱، ۵۲

(۸) ایضاً،ص۹

(۹) ایضاً،ص۱۰۲، ۱۰۳

(۱۰) ایضاً،ص۱۵، ۱۶

(۱۱) ایضاً،ص۵۶، ۵۷

(۱۲) ایضاً،ص۱۱۲

(۱۳) ایضاً،ص۷۲، ۷۳

(۱۴) ایضاً،ص۱۲

(۱۵) مستنصر حسین تارڑ، **چترال داستان**، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء،ص۸، ۹

(۱۶) ایضاً،ص۲۴، ۲۵

(۱۷) ایضاً،ص۲۹

(۱۸) ایضاً،ص۱۴، ۱۵

(۱۹) مستنصر حسین تارڑ، **رتی گلی**، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء،ص۲۲، ۲۳

(۲۰) ایضاً،ص۴۵، ۴۶

(۲۱) ایضاً،ص۲۳، ۲۴

(۲۲) ایضاً،ص۶۶، ۶۷

(۲۳) ایضاً،ص۱۳۹، ۱۴۰